محمد نصراللہ
لیکچرر اُردو، پی ایچ-ڈی سکالر (اُردو)
گورنمنٹ گرو نانک پوسٹ گریجویٹ کالج
ننکانہ صاحب

سید رفیق حسین کے افسانوں کا کرداری مطالعہ

Syed Rafiq Hussain is an important and well known figure of Urdu fiction. He wrote matchless short stories with animals as characters. This article is an in-depth study of Rafiq Hussain's human and animal characters. This article analyses the relationship between and effect of mutual relationship between animals and humans. More over unique aspects of Rafiq Hussain's stylistics qualities have been highlighted with a view to evaluating Rafiq Hussain's distinguished art.

سید رفیق حسین کا شمار اردو کے ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے جانوروں کے حوالے سے ایسے افسانے لکھے جن کی مثال پورے اردو افسانے میں مشکل ہی سے ملے گی ۔جس نقاد نے بھی ان کے افسانوں کا مطالعہ کیا، ان کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ انھوں نے کم لکھا مگر معیاری لکھا۔ اتنے اہم تخلیق کار کے افسانے پڑھ کر تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ انھیں اردو کا اُمی افسانہ نگار کہا جاتا ہے اور اس بات کا اعتراف وہ خود بھی کرتے ہیں:

''اردو بالکل نہیں لکھ سکتا، املا قطعی درست نہیں۔ میری لکھت میں خود نہیں پڑھ سکتا، نہ کوئی اور سوائے میری لڑکی کے اور اردو زبان کی گنتی کی چار پانچ کتابیں پڑھی ہوں گی'' (۱)

رفیق حسین کی اس بات کو تسلیم کرنا مشکل ہے۔ان کے پسندیدہ مصنف ''جنگ اور امن'' جیسے عظیم ناول کے تخلیق کار لیوٹا لسٹائی تھے۔ رفیق حسین فارسی بھی جانتے تھے اور اردو کی چند کتابوں کا مطالعہ بھی کر رکھا تھا۔ ایک طرف وہ یہ کہتے ہیں کہ انھوں نے اردو زبان کی چار پانچ کتابیں پڑھی ہوں گی جبکہ دوسری طرف وہ انگریزی اور اردو ادب کا تقابل بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ خواہ بہت زیادہ نہ ہو لیکن کم بھی نہ تھا۔ وہ کہانی لکھنے کی خداداد صلاحیت رکھتے تھے اور کہانی پر محنت بھی کرتے تھے:

''میں افسانہ لکھنے سے قبل اس کے پلاٹ اور تمام جزئیات کا اپنے تصور میں مکمل جائزہ لے لیتا ہوں۔'' (۲)

رفیق حسین کے بعد ابو الفضل صدیقی، سید محمد اشرف اور احمد جاوید نے بھی جانوروں اور پرندوں کے حوالے سے کافی تعداد میں افسانے لکھے اور اچھے لکھے۔ ان سب کی اپنی اپنی جگہ اہمیت ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ سید رفیق حسین جیسی بات پیدا نہ کر سکے۔

رفیق حسین کو اس قدر منفرد اسلوب کا حامل افسانہ نگار ہونے کے باوجود بھی افسانہ نگاروں کی صف میں وہ مقام

حاصل نہ ہو سکا جس کے وہ مستحق تھے۔ وقت چوں کہ اعلا یا پست ہونے کا تعین ایک نہ ایک روز کر ہی دیتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سید رفیق حسین کے فن کو بھی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ بیسویں صدی تک چار بار مختلف ناموں سے شائع ہو چکا ہے۔ مثلاً پہلی بار ''آئینہ حیرت'' کے نام سے دہلی سے شائع ہوا ، دوسری بار ''گوری ہو گوری'' کے نام سے کراچی سے شائع ہوا۔ تیسری بار ''بے زبان'' کے نام سے اور پھر ''شیر کیا سوچتا ہوگا'' کے نام سے۔ اکیسویں صدی میں بھی ان کے افسانوں کے مجموعے کا ''آئینہ حیرت'' کے نام سے شائع ہونا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کم و بیش ستر برس گزرنے کے بعد بھی انھیں بھلایا نہیں گیا؛ بلکہ جس نقاد، محقق یا مورخ نے بھی ان کے بارے قلم اٹھایا ان کی تعریف ہی میں لکھا:

> ''جب ہم اردو افسانوں کو روحانی، سماجی، نفسیاتی، جنسی وغیرہ کے خانوں میں بانٹیں گے تو جانوروں کے افسانوں کا بھی ایک خانہ بنا کر اس میں رفیق حسین کا نام درج کر دیں گے ۔۔۔۔ رفیق حسین کو ہم نے اپنے یہاں کے بڑے افسانہ نگاروں میں شامل نہیں کیا۔ یہ ان کی اور اردو کی بھی بدقسمتی تھی اور اس بدقسمتی کی توثیق اس وقت ہوئی جب رسالہ نیا دور کراچی نے اپنے ایک شمارے (۶۵) میں رفیق حسین کے لیے ڈھائی سو سے زیادہ صفحے وقف کیے'' (۳)

۱۹۶۸ء میں چھپنے والے مذکورہ رسالے میں اختر حسین رائے پوری نے ''حیوان اور انسان'' الطاف فاطمہ نے ''خزاں کے رنگ''، شمیم احمد نے ''انوکھا افسانہ نگار''، فضل قدیر نے ''گل صحرا'' سید مختار اکبر نے ''سید صاحب'' جیسے تنقیدی مضامین لکھے، جنھوں نے رفیق حسین کی شخصیت اور فن کو نمایاں کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے مضمون ''اردو کے چند انوکھے افسانے'' میں رفیق حسین کے افسانہ ''بیرو'' کا انتخاب اردو کے انوکھے افسانہ کے طور پر کیا:

> ''یہ افسانہ اس اعتبار ہی سے منفرد اور انوکھا نہیں کہ جانوروں کے بارے میں لکھی گئی ایک خوبصورت اردو کہانی ہے، یہ اس لیے بھی منفرد ہے کہ اس میں افسانہ نگار نے قاری کو زندگی کی ایک نامانوس لیکن انوکھی سطح سے آشنا کرنے میں پوری کامیابی کا ثبوت دیا ہے۔'' (۴)

ڈاکٹر انوار احمد اپنی کتاب ''اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ'' میں لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر جمیل جالبی نے بجا طور پر سید رفیق حسین کو ایک منفرد افسانہ نگار قرار دیا ہے (اوراق نومبر، دسمبر ۱۹۸۲ء ص:۲۷۴) ۱۹۴۴ء میں ان کے آٹھ افسانوں کا مجموعہ (آئینہ حیرت) شائع ہوا، اپنی ان کہانیوں کی فضا اور کرداروں کے حوالے سے اردو افسانے میں اپنے لیے مستقل مقام پیدا کر گئے۔'' (۵)

مرزا حامد بیگ ان کے افسانوں سے متعلق لکھتے ہیں:

> ''سید رفیق حسین نے جنگل کے قانون کا بھر پور مطالعہ کیا ہے اور خود جنگل کی زندگی کو سہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جنگلی جانوروں (شیرنی، کتے ،نیل بیل، بلی، بندر، گھوڑی اور ہاتھی) کی سیرت کو اس حسن اور خوبی

کے ساتھ رقم کر پائے ہیں جو محض شکاریات پر لکھنے والوں کے نصیب میں نہیں۔''(۶)

ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش انھیں یوں خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

''سید رفیق حسین کی وجہ شہرت ہی جانوروں پر افسانے لکھنے کے باعث تھی۔ ان کے افسانے آج بھی بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔''(۷)

ڈاکٹر انور سدید ''اردو ادب کی مختصر تاریخ'' میں یوں تعریف کرتے ہیں:

''رفیق حسین کی منفرد عطا یہ ہے کہ انھوں نے انسانی آنکھ سے جانوروں کی نفسیات کا مشاہدہ کیا۔۔۔ ان کے افسانے انوکھی نوعیت کے ہیں۔ ان جیسا فنکار اردو افسانے کو دوبار نصیب نہیں ہوا۔''(۸)

اختر حسین رائے پوری اپنے مضمون ''انسان اور حیوان'' میں رقم طراز ہیں:

''ان کے افسانے وہی سوال پوچھتے ہیں جو ریمن گیری نے اپنے ناول "Roots of Heaven" میں کیا ہے۔ کیا حیوان کا قاتل انسان کا دوست ہوسکتا ہے اور کیا وہ اپنے معبود کو پا سکتا ہے'' (۹)

پروفیسر سید مسعود الحسن رضوی ادیب مرحوم ''آئینہ حیرت'' سے متعلق لکھتے ہیں:

''یہ کتاب تو ایک صحیفہ آسمانی معلوم ہوتی ہے۔''(۱۰)

فضل قدیر اپنے مضمون ''کچھ میری زبانی'' میں لکھتے ہیں:

''سید رفیق حسین نے جس انداز سے جانوروں کی زندگی کے پہلو بہ پہلو انسانی زندگی کا مطالعہ کیا، اس کی کوئی مثال اردو تو اردو عالمی ادب میں بھی نہیں ملتی اور یہی بات چونکا دینے والی ہے۔ ہندوستان کی تقریباً تمام زبانوں میں ان کے افسانے ترجمے ہو چکے ہیں۔''(۱۱)

شمیم احمد اپنے مضمون ''انوکھا افسانہ نگار'' میں لکھتے ہیں:

''سید رفیق حسین ایسے فنکار ہیں جن کی چند ہی تحریریں موت کو ہمیشہ شکست دیتی آئی ہیں۔''(۱۲)

ان کے مجموعہ ''آئینہ حیرت'' میں جانوروں کے حوالے سے آٹھ افسانے شامل ہیں جن کے عنوانات درج ذیل ہیں: ۱۔کفارہ، ۲۔کلوا، ۳۔بیرو، ۴۔گوری ہو گوری، ۵۔آئینہ حیرت، ۶۔ہر فرعونے راموسی، ۷۔شیریں فرہاد، اور ۸۔بے زبان۔ ان کے علاوہ انھوں نے چند افسانے اور بھی لکھے مگر ان کی وجہءشہرت وہی افسانے بنے جن میں جانوروں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ حیوانی کرداروں کے حوالے سے لکھے گئے انھی افسانوں کی بدولت انھیں ہر سطح کے قاری کی طرف سے سراہا گیا۔ جانوروں کے حوالے سے لکھی گئی ہر کہانی اپنی مثال آپ ہے۔اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ رفیق حسین کو شکار کا شوق تھا،اس صورت میں انھیں جنگل کی زندگی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ انھوں نے جانوروں کی نفسیات کا گہرا مطالعہ کیا۔ جنگل کی زندگی اور انسانی زندگی کے درمیان تقابل کر کے انھیں محسوس ہوا کہ جانوروں کی زندگی کا طرز موجودہ انسانوں سے زیادہ مہذب ہے؛ کیونکہ جانور ان اعلا صفات کو اپنا کر زندگی بسر کر رہے ہیں جو

مہذب معاشروں کا شیوہ ہوتی ہیں؛ جبکہ انسان ان اعلا قدروں سے روز بہ روز محروم ہوتا جارہا ہے۔

رفیق حسین کے افسانوں میں جانوروں کے کردار کسی اعلا وصف کو اپنا کر انسان سے بھی بلند مقام پر دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً وفاداری، ایثار، قربانی اور محبت یہ وہ صفات ہیں جو ان کے ہر حیوانی کردار میں پائی جاتی ہیں۔ کہیں بھی ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ ان صفات کو زور زبردستی سے حیوانی کرداروں کی ذات کا حصہ بنایا گیا ہے بلکہ یوں لگتا ہے کہ وہ ان کرداروں کی فطری وجبلی صفات ہیں۔ رفیق حسین نے جانوروں کی زندگی کا گہرا مطالعہ کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ موجودہ انسان نام کا اشرف المخلوقات رہ گیا ہے؛ حالانکہ اس کی ذات میں جو خوبیاں ہونی چاہیے تھیں وہ حیوانوں کی زندگی میں بدرجہ اتم موجود ہیں، جب کہ انسان ان صفات کے آگے ہار گیا ہے۔

سید رفیق حسین کے افسانے صرف کہانی سے لطف اندوز ہونے کی دلچسپی تک محدود نہیں ہیں بلکہ کئی سوالات بھی اپنے قارئین کے اذہان میں اٹھاتے ہیں۔ مثلاً ان کے پہلے افسانے ''کفارہ'' ہی کو دیکھ لیا جائے، اس میں بہاری نے نشے کی حالت میں بلدیو سنگھ کو قتل کر دیا اور پھر موت سے بچنے کے لیے جنگل میں پناہ لے لی۔ بدقسمتی سے جنگل میں شدید بھوک کی حالت میں اس نے شیرنی کا شکار چرا لیا (جو شیرنی نے خود اپنے لیے کر رکھا تھا) جس کے ردعمل میں شیرنی اپنے غصے سے بے قابو ہو کر بہاری کو شکار لے جاتے ہوئے دیکھ کر اس پر حملہ آور ہوئی اور اسے مار ڈالا۔ بہاری کو مار دینے کے بعد وہ خود بھی پاگل ہو گئی اور اسی پاگل پن کی حالت میں کچھ اور انسانوں کا بھی خون کر دیا جس کے نتیجے میں اسے اور اس کے ایک بچے کو ایک شخص نے گولی مار کر قتل کر دیا اور دوسرے بچے کو قیدی بنا لیا۔ افسانے میں کئی کرداروں کی موت ہوئی ہے۔ مثلاً بلدیو سنگھ کے بیٹے کی موت، بہاری کی موت، شیرنی اور اس کے بچے کی موت، صرف دو کردار آخر تک زندہ رہے، بلدیو سنگھ اور شیرنی کا بچہ۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ دونوں بھی ذہنی موت مر چکے تھے۔ وہ زندہ لاشوں کی مانند زندگی کاٹ رہے تھے۔ افسانے کی آخری سطور میں اسی خیال کو مزید تقویت دی گئی ہے۔ یہ سطور کئی سوالات قارئین کے ذہن میں پیدا کرتی ہیں۔

> ''اے بھگوان میں نے کونوں پاپ کیے تھے جو مجھے یہ سزا ملی''۔۔۔یا رب! یہ دنیا کن گناہوں کا کفارہ ہے؟'' (۱۳)

مرنے والے کرداروں اور مارنے والے کرداروں کے حالات کا مطالعہ کیا جائے تو مرنے والے کردار بھی بے بس نظر آتے ہیں اور مارنے والے بھی۔ کسی کو کسی کی موت کا ذمہ دار ٹھہرا کر ذہن مطمئن نہیں ہوتا۔ ہر کردار کا ہر عمل قدرتی جبر کے زیر سایہ محسوس ہوتا ہے۔ ہر گناہ بے بسی، بے اختیاری اور لاچاری کی حالت کا پروردہ دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً بہاری نے بلدیو سنگھ کے بیٹے کو نشے کی حالت میں قتل کیا۔ اس صورت میں بہاری خود کو مجرم تو قرار دیتا ہے مگر سزا کا مستحق نہیں۔ اسی طرح بہاری کا شیرنی کا گوشت چرا لینے والا عمل بھی بھوک کی جبلت کے زیر اثر ہوا؛ بھوک نے اسے بے بس کر دیا تھا، کچھ بھی کھانے کو میسر نہ تھا اور نہ ہی وہ جنگل سے باہر نکل سکتا تھا۔ شیرنی کا بہاری کو مار ڈالنا بھی اس کی برداشت کے ختم ہو جانے کے زیر اثر ہوا کیونکہ وہ اس سے قبل بھی اسے کئی بار نظر انداز کر چکی تھی مگر اب کے بار اسے اپنے اور اپنے

بچوں کے لیے اس گوشت کے ٹکڑے کے ضرورت تھی ۔ایک اور انسانی کردار کا پاگل شیرنی اور اس کے بچے کو قتل کر دینے کا عمل بھی جرم کے دائرے میں نہیں آتا۔ بلدیو سنگھ کا باپ اور شیرنی کا تنہا سلاخوں کے پیچھے قیدرہ جانے وا لا بچہ بھی بے قصور نظر آتے ہیں۔ مجموعی طور پر کہانی کے تمام کردار قدرتی جبر کی زد میں دکھائی دیتے ہیں۔ کہانی میں اگر انسانوں اور جانوروں کے ایک دوسرے پر اثرات کا جائزہ لیا جائے تو انسانی کردار حیوانی کرداروں کی زندگیاں برباد کرتے نظر آتے ہیں، اگر بہاری جنگل کا رخ نہ کرتا تو شیرنی اور اس کے بچے کو اپنی زندگی سے ہاتھ نہ دھونے پڑتے اور نہ ہی اس کے بچے کو سلاخوں کے پیچھے قید ہو کر زندگی بسر کرنا پڑتی۔

اردو میں کتوں پر لکھے جانے والے افسانوں میں ''کلوا'' کا شمار بہترین افسانوں میں ہوتا ہے جس میں کلوا(کتا) منن(بچہ) کی جان بچانے کی خاطر تالاب میں کود کر اپنی جان دے دیتا ہے۔کلوا کو اپنی ذات سے اتنی محبت نہیں تھی جتنی چندو(لڑکی) اور منن سے تھی۔ عالمی ادب میں سب سے زیادہ کتے پر لکھا گیا ہے۔ اس حوالے سے میکسم گورکی، جیک لنڈن، صادق ہدایت، انتظار حسین، مشتاق یوسفی، علی عباس حسینی، سید رفیق حسین اور اشفاق احمد کا نام قابل ذکر ہے۔

کتے پر سب سے زیادہ لکھے جانے کی وجہ اس کی وفاداری ہے۔ رفیق حسین کے افسانے ''کلوا'' میں بھی یہ خصوصیت نمایاں نظر آتی ہے۔

''بیرو'' افسانہ میں نیل گائے کے گلے میں انسان کی طرف سے کنٹھا پہنا دیا جاتا ہے۔جس وجہ سے اس کی ہم جنس برادری اس سے خوف زدہ رہتی ہے۔ جونہی وہ کنٹھا ٹوٹتا ہے، اس کی برادری اس کے قریب آجاتی ہے۔ انسان ہی کی طرف سے ریچھ کی ریچھنی کو گولی سے مار دیا گیا جس کے نتیجے میں ریچھ پاگل ہو گیا اور ایک روز غیر متوقع طور پر شیر سے لڑ کر جان کی بازی ہار گیا اور ساتھ ہی ساتھ شیر بھی ریچھ سے لڑتے ہوئے مر گیا۔نیر مسعود انسان کے جانوروں سے متعلق رویے پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

> ''حیوان فطری وجود کا نمائندہ ہے اور انسانی وجود اس کو کبھی مسخ کرتا ہے، کبھی خطرے میں ڈالتا ہے اور کبھی فنا کر دیتا ہے۔ اسے رفیق حسین کا بنیادی موضوع خواہ نہ کہا جائے لیکن یہ ان کے افسانوں کا ایک مشترک موضوع ضرور ہے۔'' (۱۴)

سید رفیق حسین کے آٹھوں افسانوں میں حیوان انسان کی طرف سے خطرے کی زد میں دکھائی دیتا ہے۔ انسان حیوانی زندگیوں کی پروا کیے بغیر انھیں کچلتا دکھائی دیتا ہے۔

''گوری ہو گوری'' میں انسانوں اور جانوروں کو سیلاب جیسی قدرتی آفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ گوری(گائے) کا بچھڑا کھونٹے سے بندھا تھا اور سیلاب کا پانی آہستہ آہستہ بڑھتا ہوا اس کی ناک تک جا پہنچا۔ گوری اپنے بچھڑے کی جان بچانے کے ساتھ ساتھ بسنتی کی رمکلیا کی جان بچانے میں کامیاب ہو گئی۔ جس طرح بسنتی کو اپنی رمکلیا سے محبت تھی اور اس کی غیر موجودگی میں اس نے رو رو کر اپنا برا حال کر لیا تھا اسی طرح گوری کو بھی اپنے بچھڑے سے اتنی ہی محبت تھی۔ گوری کی آواز اور اس کے ردعمل میں بچھڑے کی آواز کو قاری تک پہنچانا اور پھر اسے اس آواز میں چھپے درد کو محسوس کرانا

سید رفیق حسین کے منفرد اسلوب کی خصوصیت ہے:

''وہیں پر ان کی گوری گائے کھڑی اراتی تھی تو کاں آں ھ، تو کاں آں ھ۔ یہ بھی دکھ پیٹی ماں ہے۔ ارے کوئی جانے نہ جانے۔ بچھڑا اس کا بھی نہیں ملتا ہے۔ دکھیا روتی ہے۔ تو کاں آں ھ۔۔۔''اوں ماں آں ھ'' باغ کی آڑ سے بچھڑے کی آواز تھی۔'' (۱۵)

رفیق حسین کے دوسرے افسانوں میں بھی جانوروں کی مختلف کیفیات کی عکاسی فطری انداز ہی میں ہوئی ہے جسے قاری محسوس کرتا ہے۔

آئینہ حیرت'' ایک بندریا اور اس کے بچے کی کہانی ہے ۔ایک آدمی اپنی بیگم کے شوق کو پورا کرنے کے لیے بندریا کے بچے کو اس سے چھین لیتا ہے۔ اس کے بعد بندریا اور اس کے بچے کی ایک دوسرے کے بغیر کیا حالت ہوئی، کہانی میں ان کیفیات کو نمایاں کیا گیا ہے۔ کہانی کے آخر پر بندریا لینڈ سلائیڈ کا شکار ہو کر جان کی بازی ہار جاتی ہے۔ اس افسانے میں بندریا کی موت کی وجہ انسان ہی بنا۔

''ہرفرعونے راموسی'' کانے ہاتھی کی کہانی ہے جو انسان کی گولی سے کانا ہو کر ہر کسی پر اپنا قہر وغضب ڈھاتا ہے۔ جانور کیا، انسان کیا ہر کوئی اس کے ظلم کا نشانہ بنتا ہے۔ اس کے ظلم کے نتیجے میں اسے مارنے کا انعام پانچ سو روپے تھا۔ میجر بوسٹ نے اس انعام کی خاطر ہاتھی کو مارنا چاہا مگر اپنے لالچ میں ناکام ٹھہرا؛ جب کہ بدل اور اس کے باپ کلوا پلاسی نے کانے ہاتھی کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ یہاں تک کہ بدل لڑتے لڑتے مارا گیا ؛ مگر کلوا پلاسی نے اپنے بیٹے کا انتقام لیے بغیر دم نہ لیا۔ کہانی میں میجر بوسٹ کا کردار بزدلی اور خودغرضی کی علامت ہے جب کہ بدل اور کلوا پلاسی کا کردار ہمت اور بہادری کی علامت بن کر آیا ہے۔ اسی طرح کانے ہاتھی کا کردار فرعونیت اور ظلم کی عکاسی کرتا ہے ۔سید رفیق حسین کے افسانوں میں یہ واحد ایسا افسانہ ہے جس میں کسی جانور کی وجہ سے انسانوں کی جانیں گئیں۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھی انسان ہی کی گولی کھا کر کانا ہوا تھا جس کے نتیجے میں وہ ظلم و بربریت کی علامت بنا۔ کہانی کا انجام اس خیال کی ترجمانی کرتا ہے کہ ہر دور میں فرعون کا مقابلہ کرنے کے لیے قدرت موسیٰ بھی پیدا کرتی ہے۔

''شیریں فرہاد'' میں انسانی کردار اقبال بلی اور بلے کو کمرے میں مقفل کر کے گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں بلی اور بلا بھوک کا زندگی کے آخری لمحے تک مقابلہ کرتے ہیں۔ بلی کی ہمت جواب دے جاتی ہے اور وہ مرنے کے قریب پہنچ جاتی ہے۔ بلا اپنی بھوک سے بے تاب ہو کر بالآخر اپنی محبوبہ کو کھا جاتا ہے اور پاگل ہو کر اسے مدتوں کوٹھوں، گلیوں اور گھروں میں ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ شیریں اور فرہاد کے علاوہ انسانی کردار نسیمہ اور اقبال بھی قابل ذکر ہیں۔ نسیمہ کو چھوڑ کر اقبال نے دوسری شادی کر لی۔ نسیمہ کو شیریں (بلی) کے مماثل قرار دے کر دیکھا جائے تو شیریں فرہاد (بلا) کے ہاتھوں مر کر دنیا کی تمام تکلیفوں سے رہا ہو گئی یعنی اس کے عاشق فرہاد نے اس کا گلا دبا کر، اسے موت کی نیند سلا کر دردبھری زندگی سے چھٹکارا دلا دیا جب کہ اقبال اتنا بھی نہ کر سکا ۔فرہاد نے جس حال میں شیریں کو اپنی خوراک بنایا وہ اسے نہ بھی کھاتا تو پھر بھی چند لمحوں تک اس کی موت واقع ہو جانی تھی۔ اقبال نے نسیمہ کو جس حال میں چھوڑا اس

سے بہتر تھا کہ وہ اسے موت کی نیند سلا دیتا؛ تاکہ وہ دوسروں کے رحم و کرم پر جینے اور روز روز کی موت سے بچ جاتی۔ دراصل اس کے لیے شادی شدہ ہو کر بیوہ کی سی زندگی بسر کرنا موت سے بھی زیادہ اذیت ناک تھا۔ اقبال کا دوسری شادی کر کے الگ ہونے کا فیصلہ کرنا اور نسیمہ کو بن طلاق دیے زمانے کے رحم و کرم پہ چھوڑنا انسانی بے حسی اور خود غرضی کی عکاسی کرتا ہے۔

''بے زبان'' میں ایک گھوڑی اپنی مالکن (گونگی لڑکی) سے وابستہ ہو کر زندگی کے دن ہنسی خوشی گزار رہی تھی۔ اس گھوڑی کو اس کی مالکن سے الگ کر کے سرکس والوں کو دے دیا گیا جہاں اس کا وقت بہت کٹھن گزرا اور اسے زندگی خود پر بوجھ محسوس ہوئی۔ کافی عرصے بعد گھوڑی نے اپنی پرانی مالکن کو دیکھا تو پاگل سی ہو گئی اور یہی پاگل پن اسے موت کی آغوش میں لے گیا:

> ''وہ دونوں مسکین، بے زبان مسافر، اسی منزل مقصود کو پہنچ گئے۔ جدھر ہم سب دنیا کے مسافر بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ پندرہ میل کے بعد بڈھی گھوڑی کے پیر لڑکھڑائے، سر پٹ بھاگنے میں ٹھوکر کھائی، منہ کے بل زمین پر گری۔ اس کا بھی سر پاش پاش ہو گیا۔ گونگی عورت کی بھی ہڈی ہڈی ٹوٹ گئی جس نے کہ گھوڑی سے بھی دس گز آگے پکی سڑک پر پٹخنی کھائی تھی۔'' (۱۶)

گونگی لڑکی کے ساتھ ساتھ گھوڑی بھی جان کی بازی ہار گئی۔ اس سارے عمل کی وجہ بھی انسان ہی بنا۔ سید رفیق حسین کے صرف اس افسانے کے نہیں بلکہ تمام افسانوں کے کردار موت کو گلے لگاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نفسیاتی تناظر میں اگر ان کرداروں کی موت کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کرداروں پر جبلت مرگ حاوی ہے۔ سگمنڈ فرائیڈ نے اپنے مقالہ "Beyond the Pleasure Principle" میں جبلت حیات (Eros) اور جبلت مرگ (Thanatos) پر روشنی ڈالی ہے جس کے مطابق عضویہ کے اندر دو طرح کے اعمال کا سلسلہ چلتا رہتا ہے ایک تعمیری اور دوسرا تخریبی۔ اول الذکر کے تحت خلیوں کی تعمیر کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور موخر الذکر کے تحت خلیوں کی تخریب اور موت ہوتی رہتی ہے۔ خلیوں کی یہ تعمیر و تخریب ہی عضویہ کے وجود کو برقرار رکھتی ہے۔ ڈاکٹر نعیم احمد اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''جبلت مرگ ہر زندہ شے کے اندر پائی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسا رجحان ہے جو عضویہ کو واپس غیر نامیاتی مادے کی اولین حالت مرگ میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ فرائیڈ کہتا ہے کہ جبلت مرگ کبھی کبھی قاتلانہ اور متشددانہ روپ بھی اختیار کر لیتی ہے۔ یعنی ''مرنے کی خواہش'' ''مارنے'' کی خواہش بھی بن جاتی ہے۔ چنانچہ دوسروں کو مارنے کا عمل فرائیڈ کے نزدیک جبلت مرگ کا ہی اظہار ہے۔'' (۱۷)

فرائیڈ کے نزدیک جبلتیں رجعت پسند ہیں اور وہ اپنی اسی حالت کی طرف واپس جانا چاہتی ہیں جس میں وہ پہلے تھیں۔ مثلاً زندگی سے پہلے انسان کا وجود نہیں تھا اور زندگی ملنے کے بعد انسان اسی حالت کی طرف پلٹنا چاہتا ہے جس میں زندگی ملنے سے قبل ہوتا ہے:

> ''چیزوں کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی پہلی حالت میں لوٹ جائیں اور اس طرح بدھ مت کی زبان میں

نروان حاصل کریں۔ چنانچہ ان اصولوں کا تانا بانا کچھ اس طرح بنا گیا ہے کہ یہ تہ در تہ تھیوری زندگی کو موت کی زبان میں بیان کرتی ہے۔ یعنی نباتاتی حالت کی طرف جانا ایک بنیادی جبر ہے۔ اس لیے جبلت مرگ (Thanatos) کا اصول اعادہ ہے۔'' (۱۸)

مذکورہ اقتباسات کی روشنی میں دیکھا جائے تو سید رفیق حسین کے قریباً تمام کرداروں کا سفر موت کی طرف دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً ''کفارہ'' میں بہاری، بلدیو سنگھ کے بیٹے، شیرنی اور اس کے بچے کی موت ہوتی ہے۔ ''کلوا'' میں کتا منن کی خاطر جان قربان کر دیتا ہے۔ ''بیرو'' میں شیر اور ریچھ ایک دوسرے سے لڑتے ہوئے فنا ہو جاتے ہیں۔ ''گوری ہو گوری'' واحد ایسا افسانہ ہے جس میں بچھڑا مرتے مرتے بچ جاتا ہے۔ ''آئینہ حیرت'' میں بندریا لینڈ سلائیڈ کا شکار ہو کر جان کی بازی ہار جاتی ہے۔ ''ہرفرعونے را موسیٰ'' میں بدل اور کانے ہاتھی کی موت ہوتی ہے۔ ''شیریں فرہاد'' میں بلی اپنے عاشق کے ہاتھوں مر جاتی ہے۔ ''بے زبان'' میں گھوڑی اور گونگی عورت پر جبلت مرگ حاوی ہے جو انھیں death drive کی طرف لے جاتی ہے اور ان کا خاتمہ بالآخر موت ہی پر ہوتا ہے۔

اسی طرح سید رفیق حسین کے کردار خواہ وہ جانور ہوں یا انسان، قدرت کے بے رحم قوانین کی زد میں زندگی کاٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ہر جگہ پر بے بس، بے اختیار اور کسی جبری قوت کے رحم و کرم کے زیر اثر دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً اگر جانوروں کے کرداروں ہی کا ذکر کیا جائے تو ''کفارہ'' میں شیرنی بے بس ہو کر بہاری پر حملہ کرتی ہے اور بالآخر آدم خور ہو کر اپنی اور اپنے بچے کی جان کی دشمن بن جاتی ہے۔ پھر اسی شیرنی کے زندہ رہ جانے والے بچے کو عمر بھر کٹہرے کی سلاخوں کے پیچھے زندگی بسر کرنا پڑتی ہے۔ وہ ان سلاخوں سے باہر نکلنے میں بے اختیار نظر آتا ہے۔ ''کلوا'' میں کتا اپنی وفاداری کی جبلت آگے بے بس دکھائی دیتا ہے۔ ''بیرو'' میں نیل گائے اپنے گلے سے کنٹھا اتارنے میں بے بس ہے۔ اسے اس بات کا علم ہی نہ ہو سکا کہ وہ اس کنٹھے کی وجہ سے اپنے ہم جنسوں کی دوری برداشت کر رہا تھا۔ ''گوری ہو گوری'' میں سب انسان اور حیوانی کردار قدرتی آفت کے آگے سر تسلیم خم کیے ہیں۔ ''آئینہ حیرت'' میں بندریا کو بغیر کسی کو نقصان پہنچائے اپنے بچے کی قربانی دینا پڑی۔ ناحق اسے وہ سب کچھ جھیلنا پڑا جس کے بارے میں اس نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ ''ہرفرعونے را موسیٰ'' میں انسان کی گولی نے ہاتھی کو ظالم و جابر بنا دیا۔ اس نے ایسی کوئی حرکت نہ کی تھی جس کی بنا پر اسے گولی ماری جاتی۔ خواہ مخواہ وہ انسان کی گولی سے کانا ہو گیا۔ ''شیریں فرہاد'' میں بلی اور بلا بغیر کسی جرم کے ایک کمرہ نما جیل میں مقفل ہو گئے جس کے نتیجے میں بلی جان کی بازی ہار گئی۔ ''بے زبان'' میں گھوڑی کو بغیر اس کی مرضی کے اس کی مالکن سے جدا کر کے سرکس میں بھیج دیا گیا اور اس کے بعد ان کی زندگی کا خاتمہ ایک جذباتی ملاقات پر ہوا۔

تمام افسانوں میں رفیق حسین کے حیوانی کردار بے بس اور بے اختیار نظر آتے ہیں۔ وہ قدرت کے جبر کو سہنے کے ساتھ ساتھ انسانوں کے ظلم و ستم کا شکار بھی ہوتے ہیں۔ رفیق حسین کے مذکورہ تمام افسانوں میں جانوروں کی موت کا سبب انسان ہی بنے۔ انسانوں ہی نے جانوروں کی زندگی میں مداخلت کر کے ان کی زندگی کو تباہ کرنے میں پہل کی۔

پھر ردعمل میں شیرنی آدم خور ہوئی، نیل گائے نے ریچھ اور شیر کو ایک جھٹکے سے ہزاروں فٹ کی بلندی سے نیچے گرا دیا، بندر یا انسان کا بچہ لے بھاگی، ہاتھی ظلم کی علامت بنا، فرہاد شیریں کی جدائی میں پاگل ہوا، گھوڑی کے پاؤں لڑکھڑائے اور وہ زمین پر پٹخنی کھا کر سر پاش پاش کرا بیٹھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حقیقی زندگی میں کیا حیوان واقعی اس قدر بے بس اور لاچار نظر آتا ہے یا پھر رفیق حسین نے جانوروں سے متعلق انسانوں کے اندر ہمدردانہ جذبات پیدا کرنے کے لیے انھیں بے اختیار دکھایا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ علم اور شعور کی سطح پر کائنات میں کوئی دوسری مخلوق انسان کی ثانی نہیں ہے۔ انسان نے اپنی زندگی کو پر آسائش بنانے کی خاطر دنیا کی ہر شے کو تسخیر کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ٹھہر اہے۔ جانوروں کو بھی انسان نے اپنی سہولت کے تحت استعمال کیا ہے۔ انسان نے ان سے اپنی خوراک کی ضرورت پوری کی ہے۔ اپنے کاندھوں کا بوجھ ان پر ڈال دیا ہے۔ انسان نے جانور کے بچے کے حصے کا دودھ اپنے بچے کو پلایا ہے ۔وہ اپنے شوق کو پورا کرنے کی خاطر ان کی جانوں سے کھیلتا ہے۔ کہیں وہ جانوروں کے بچوں کو ان سے جدا کر کے اپنی جمالیاتی حس کو تسکین پہنچا رہا ہے تو کہیں وہ ان کے پر کاٹ کر کے ان کو اڑنا بھلا رہا ہے۔ انسان نے انھیں اپنی تفریح کی خاطر چڑیا گھروں میں بند کیا ہے، اپنے گھروں میں قید کیا ہے۔ انسان نے اس مخلوق کے ساتھ جو چاہا ہے وہ کیا ہے۔ انسان کا جی چاہا تو اس نے اس مخلوق کو ایسی محبت دی کہ جسے دیکھ کر غریب انسان کی آنکھ بھر آئی اور اس نے اپنے جی میں جانور بننے کی خواہش پیدا کی:

> ''وہ گھوڑے کی گردن، بغلوں اور پیٹ پر سے پسینہ پونچھتا جاتا تھا۔۔۔وہ کیا سوچ رہا تھا؟ کیا وہ آواگون کے مسئلے پر غور کر رہا تھا؟ کیا وہ یہ چاہ رہا تھا کہ اب کے جب وہ مر جائے تو اس کا جنم گھوڑے کی جون میں ہو۔'' (۱۹)

کہیں انسان نے جانور کو اپنی آرائش گاہوں میں جگہ دی اور اس کے لیے قبرستان تک بنا دیے اور کہیں انسان نے اسے اپنے پاؤں تلے کچل کر اسے اس کے ادنیٰ مخلوق ہونے کا احساس دلایا۔ یہ مخلوق جنگل میں رہے تو انسان وہاں بھی پہنچ جاتا ہے، انسانوں کی بستی میں رہے تو بھی انھیں کے رحم و کرم پر ہے۔ انسان چاہے تو اس مخلوق کو دھتکار دے، چاہے تو نوالہ ڈال دے ۔سید رفیق حسین کے افسانے اس تکلیف دہ پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ انسان کی وجہ سے حیوان خطرے میں ہے۔ اک زمانہ تھا کہ انسانی وجود کو حیوان سے خطرہ لاحق تھا اور اک زمانہ ہے کہ حیوانی وجود کو انسان سے خطرہ ہے۔ اسی خطرے کا اظہار منشاء یاد بھی اپنے افسانے ''ایک تھی فاختہ'' میں کرتے ہیں:

> ''جہاں کوے زیادہ ہو جائیں وہاں سے فاختائیں ہجرت کر جاتی ہیں۔'' (۲۰)

سید رفیق حسین کے انسانی اور حیوانی کرداروں کے درمیان موازنہ کرنے کی صورت میں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جانور انسانوں سے بہتر اور قوانین و ضوابط کے دائرے کے اندر رہ کر زندگی بسر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً اگر ایک جانور جنگل میں کسی دوسرے جانور کا شکار کرتا ہے تو وہ اپنی بھوک کی جبلی ضرورت کو پورا کرنے کی خاطر، نا کہ کسی کو بلاوجہ

قتل کرنے کی خاطر۔ مثلاً شیر ایک وقت میں پچپن کلو تک ماس کھا جاتا ہے، اس سے اگر زائد بچ جائے تو اسے محفوظ کر لیتا ہے۔ دوبارہ بھوک لگنے کی صورت میں وہ نیا شکار کرنے کے بجائے بچا ہوا گوشت کھانے کو ترجیح دے گا۔ شیر کئی دن بھوک برداشت کر سکتا ہے لیکن جب اس کی بھوک برداشت سے باہر ہونے لگے تو پھر شکار کرتا ہے۔ یعنی جانور ضرورت کے تحت شکار کرتے ہیں، بلاوجہ نہیں۔

سید رفیق حسین کا اسلوب بھی ان کے موضوعات اور کرداروں کی طرح منفرد ہے۔ ان کے افسانوں میں جانوروں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ جس انداز سے ان آوازوں کو ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں، قاری ان کو محسوس کرتا ہے۔ ان کے افسانوں میں گائے کی آواز، بلی کی آواز اور گلہری کی آواز لفظوں میں سنائی دیتی ہے۔ گائے اور بچھڑے کی ایک دوسرے کی جدائی کے بعد وصال کی گھڑیوں کے قریب آنے کی صورت میں اُن کی جو آوازیں نکلتی ہیں:

''تو کاں آں ھ، تو کاں آں ھ۔۔۔او ماں آں ھ۔۔۔تم ماں آں ھ۔ہم ماں آں ھ۔'' (۲۱)

اسی طرح ''شیریں فرہاد'' میں شیریں (بلی) جب زندگی کی آخری سانسیں لے رہی ہوتی ہے تو اس دوران میں اس کی نکلنے والی آواز رفیق حسین نے یوں سنائی ہے:

''آؤ'' سے ''عاؤ'' ہوا اور ''عاؤ'' سے ''عاعو'' ہو گیا۔'' (۲۲)

سید رفیق حسین کے منفرد اسلوب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ بعض جگہوں پر وہ لفظی تکرار سے تحریر کے حسن کو دونا کر دیتے ہیں:

''بلے کو بھیانک آوازیں نکالتے دیواروں دیواروں پھرتے دیکھا۔۔۔شیریں کو کوٹھوں کوٹھوں، گلیوں گلیوں اور گھروں گھروں تلاش کرتا پھرا۔'' (۲۳)

جانوروں کی نفسیات سے متعلق ان کے ہاں ایسی ایسی باتوں کا ذکر ملتا ہے جو بیک وقت قاری کے علم، حیرت اور دلچسپی میں اضافہ کرتی ہیں:

''جنگل کے تمام جانور انسان سے اس قدر ڈرتے ہیں گویا انسان مارنا ان کو حرام ہے۔۔۔شیر انسان سے نہ ڈرتا تھا لیکن جنگل کے قوانین اس طرح شکن ہوتے دیکھ کر تھرا گیا۔'' (۲۴)

''اصلیت یہ ہے کہ دہلی اور بمبئی کی سڑکوں سے کہیں محفوظ جنگل میں پھرنا ہوتا ہے۔'' (۲۵)

رفیق حسین نے انسانوں کی زندگی کے ساتھ ساتھ حیوانوں کی زندگی کا بھی گہرا مشاہدہ کیا اور انھیں ایک ایسی مخلوق پایا جو انسانوں کے لیے بڑی حد تک بے ضرر ہے مگر ساتھ ہی ساتھ انھوں نے اس بات پر بھی غور کیا کہ انسان کا وجود حیوان کے لیے خطرے سے خالی ثابت نہیں ہوا۔ موجودہ دور میں تو انسان نے ایسے ایسے ہتھیار ایجاد کر لیے ہیں جو جانور تو کیا خود انسانی وجود کے لیے بھی بہت مہلک ثابت ہو رہے ہیں۔ عصر حاضر میں سڑکوں پر پڑی جا بہ جا مختلف جانوروں

کی لاشیں اگر کسی حد تک جانوروں کی اپنی غلطی کی سزا ہیں تو کسی حد تک یہ انسان کی بے احتیاطی کی بھی عکاسی کرتی ہیں۔

رفیق حسین نے روز مرہ میں پیدا ہونے والی غیر ضروری آوازوں کو نظر انداز کر کے فطرت کی آوازوں کو نہ صرف سنا ہے بلکہ ان کا اظہار اپنے فن میں کر کے قارئین کو بھی انھیں سنایا ہے۔ انھوں نے جانوروں کو سانس لیتی زندہ مخلوق سمجھ کر ان کی زندگی کو قریب سے دیکھا ہے۔ ان کے احساسات و جذبات کی زبان کو سننے اور سنانے کی کوشش کی ہے مگر یہ کوشش تبلیغی انداز سے نہیں کی بلکہ فنکارانہ انداز سے کی ہے۔ ان کے افسانے پڑھ کر جانوروں کی زندگی پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ ان کی حرکات وسکنات سے لطف اندوز ہونے کو جی چاہتا ہے۔ رفیق حسین کے نزدیک جانوروں سے محبت فطرت سے محبت کے مترادف ہے کیونکہ یہ مخلوق فطرت کا اہم حصہ ہے مگر موجودہ دور میں انسان کی توجہ اس سے ہٹتی جا رہی ہے:

"We have no time to stand and stare?

No time to Stand beneath the boughs

And stare as long as sheep or Cows."..(26)

انسان نے اپنے وقت کو اس قدر قیمتی بنا لیا ہے کہ وہ کوئی سودا بے قیمت کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہے؛ حالانکہ کئی خوبصورت مظاہر مفت میں اس کی زندگی میں رنگ بھرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ مجموعی طور پر رفیق حسین کے افسانوں کا جائزہ لیا جائے تو ان کے افسانے پڑھنے کے بعد انسان کی جانوروں کی زندگی کو دیکھنے والی آنکھ، وہ نہیں رہ جاتی جو ان کے افسانے پڑھنے سے قبل ہوتی ہے۔ احساسات و جذبات بھی وہ نہیں رہ جاتے جو عام طور پر اس سے قبل ہوتے ہیں۔ ان کے افسانے غیر محسوس طریقے سے انسانی فکر کی جانوروں کی زندگی سے متعلق قلب ماہیت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ نیر مسعود، منتخب مضامین، آج، کراچی ۲۰۰۹ء، ص:۳۵۱

۲۔ ایضاً، ص:۳۵۴

۳۔ ایضاً، ص:۳۵۷

۴۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، نئے مقالات، جمہوری پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص: ۱۰۹

۵۔ انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء، ص: ۶۰۵

۶۔ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، اردو افسانے کی روایت، ، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص: ۱۰۰

۷۔ سلیم آغا قزلباش، جدید اردو افسانے کے رجحانات، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۰ء ، ص:۶۵۶، ۶۵۵

۸۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، عزیز بک ڈپو، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص: ۴۸۷

۹۔ رفیق حسین، سید، آئینہ حیرت، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص: ۳۵۵

۱۰۔ ایضاً،ص:۳۴۲

۱۱۔ ایضاً،ص:۳۴۴

۱۲۔ سہ ماہی،''نیا دور''، پاکستان کلچرل سوسائٹی، کراچی، شمارہ نمبر ۴۶، ۴۵، خصوصی گوشہ سید رفیق حسین، ۱۹۶۸،ص:۱۲۵

۱۳۔ آئینہ حیرت،ص:۲۲

۱۴۔ منتخب مضامین،ص: ۳۵۸

۱۵۔ آئینہ حیرت،ص: ۵۹،۵۶

۱۶۔ ایضاً،ص: ۱۶۲

۱۷۔ نعیم احمد، ڈاکٹر،فرائڈ نظریہ تحلیل نفسی، ،مشعل بکس،لاہور، ۲۰۰۶،ص:۷۵

۱۸۔ شہزاد احمد،فرائیڈ کی نفسیات۔دو دور۔، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵،ص: ۳۳۶

۱۹۔ غلام عباس، آنندی، مکتبہء جدید لاہور، ۱۹۶۸،ص: ۱۲۶،۱۲۵

۲۰۔ منشا یاد کے منتخب افسانے،مقدمہ و انتخاب، پروفیسر ڈاکٹر اقبال آفاقی، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۰۹ء، ص: ۱۸۲

۲۱۔ آئینہ حیرت،ص: ۶۱، ۵۹، ۵۶

۲۲۔ ایضاً،ص: ۱۲۶

۲۳۔ ایضاً،ص: ۱۴۸

۲۴۔ ایضاً،ص: ۲۱۔۱۸

۲۵۔ ایضاً،ص: ۷۷

26. Kaneez Aslam, Shuaib bin Hassan, (compiled and Edited) 2007, P.No:1 Lahore, The Carwan Book House,